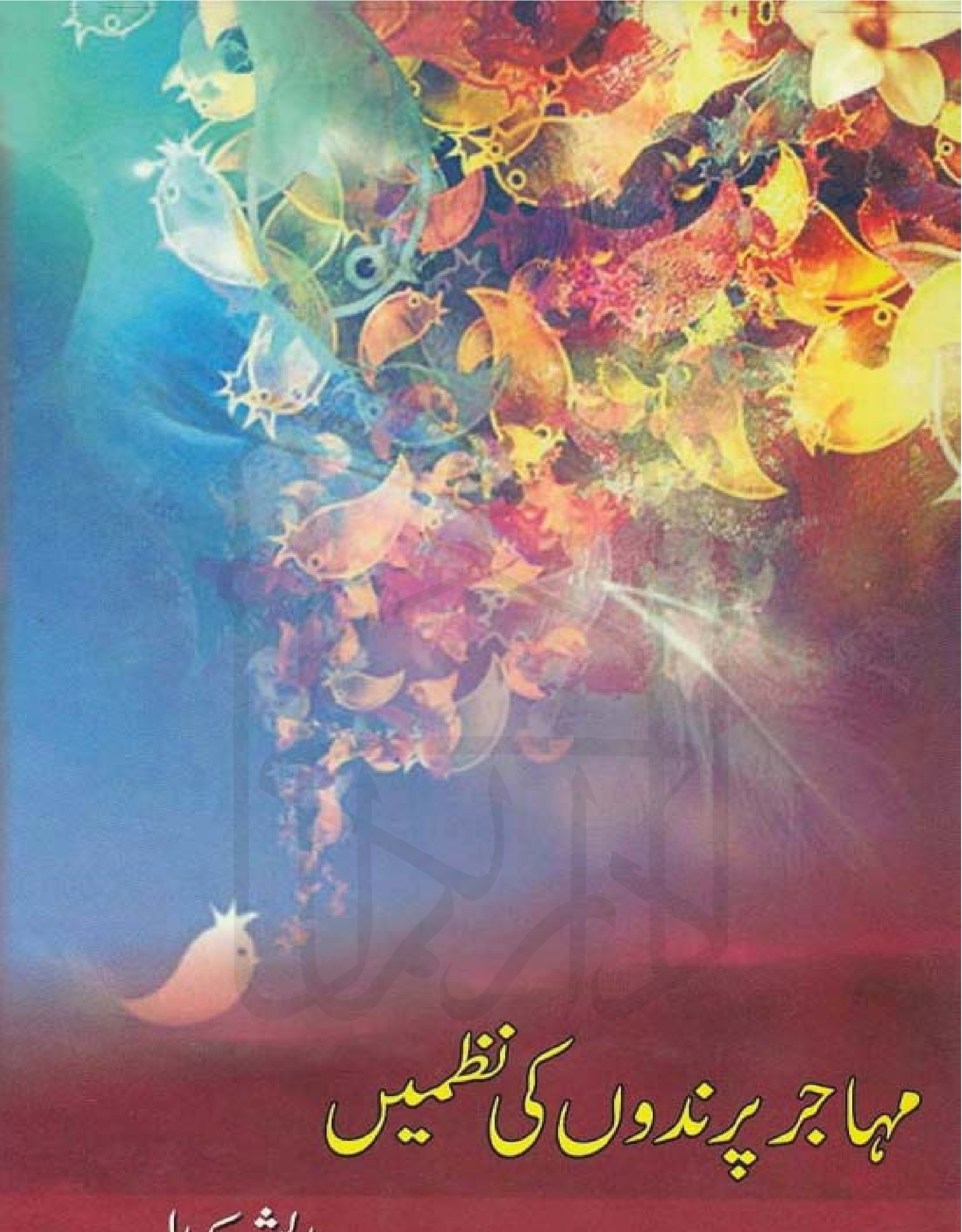


دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

مہاجر پرندوں کی نظمیں

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

مہاجر پرندوں کی نظمیں

تابش کمال

کمال پبلی کیشنز
راولپنڈی

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

کمال پبلی کیشنز
کی
کمال کتابیں



نام کتاب: مہاجر پرندوں کی نظمیں

شاعر: تابش کمال

نقش اوّل: 15 اپریل، 2005ء

نقش دوم: اگست، 2010ء

آرائش، اہتمام: عابد سیال (0333-5193903)

تعداد: ایک ہزار

قیمت: ایک سو پچیس روپے

مطبع: پریمیئر پریس، راولپنڈی

رابطہ: دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
موبائل: 0300-5144878

برادرانِ محترم و مکرّم

جاوید اقبال قاضی،

ثاقب کمال قاضی

اور

عزیزم

مراد کمال قاضی

کے نام

پرورش

مرشد گرامی پروفیسر باغ حسین کمالؒ کا ایک یادگار خط

۷۸۶

دارالفیضان

۱۔ ستمبر ۹۲ء

تابش جی! السلام مسنون

ابھی آپ کا خط ملا۔ اللہ کرے کہ آپ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ مگر اس کے لیے مناسب لائحہ عمل اور حوصلہ درکار ہے۔ میرے خیال میں آپ پنجابی میں ایم۔اے کی تیاری کریں۔ اگر یہ خیال آپ کو پسند آئے تو لکھیں تاکہ لاہور سے آپ کے لیے کتابیں منگوا لوں۔

آپ کی نظم پسند آئی —

مقام ارفع — ہمیں جو بخشا کسی کو نہ ایسا عطا کر۔

اب ظاہر ہے کہ دنیاوی طور پر تو مقام رفیع، منصب، امارت اور علم و حکمت کے اعتبار سے ہی ہو سکتا ہے۔ سو وہ آپ یقیناً پاکستان کی صدارت و وزارت کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ البتہ روحانی اعتبار سے آپ کو ایک ایسے منصب پر فائز کیا گیا ہے کہ حضرت اہل ارواح آپ پر رشک کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے مجھے آپ پر ناز ہے — اور ہاں یہ سب کچھ بھی محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور حضور اکرم کی شفقت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جہاں تک اعمال کا تعلق ہے، ہزاروں لوگ زہد و عبادت میں تم سے بڑھ کر ہیں۔

جیتے رہو خوش رہو — کی دعا کے ساتھ

خیر اندیش

[signature]

تابش کمال اور جدید شاعری

تابش کمال کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک پنجابی کا ''شام پئی بن شام'' اور ایک اردو کا ''منظر منظر دھوپ''۔ اس وقت میرے پیشِ نظر ان کے تیسرے مجموعہ ''مہاجر پرندوں کی نظمیں'' کا مسوّدہ ہے۔ اپنی پنجابی کتاب میں تابش نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی اور پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب کا رکن ہے۔ یہ بات اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ اس سے اس کے نظریۂ شعر پر روشنی پڑتی ہے۔ یوں تو یہ ضروری نہیں کہ کسی انجمن کا رکن بن کے کوئی اس کے نظریۂ شعر کا پابند بھی ہو مگر چونکہ اس کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو اہم ضرور سمجھتا ہے۔

یوں تو اب یہ اختلافات برائے نام ہی رہ گئے ہیں مگر کسی زمانے میں ان باتوں کو بہت اچھالا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے میرا ذہن پچھلی صدی کی تیس اور چالیس کی دہائیوں کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدید شاعری کئی مراحل سے گزرنے کے بعد ایک حتمی شکل اختیار کر رہی تھی۔ راشد اور میراجی کی شعری دنیا میں وہی حیثیت تھی جو منٹو اور بیدی کی جدید افسانے میں تھی۔ بات اگر صرف اتنی ہی ہوتی تو میں یہاں اس کا ذکر نہ کرتا۔ ہوا یوں کہ مجھے یہ مسوّدہ دیکھتے ہوئے پچھلی صدی کی ان دہائیوں کی شاعری بے ساختہ یاد آئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مغربی ادب کے وسیع مطالعے کے باعث اس زمانے کے انگریزی شعراء کا بہت چرچا تھا۔ خصوصاً ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ اور ان کے بعد آڈن، سپینڈر، سی۔ ڈے لیوس اور لوئی میکنس وغیرہ کی تحریریں بہت توجہ اور رغبت سے پڑھی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے بعد تک چلا۔ پھر 1947ء کے واقعات اور سیاسی حالات ادب پر بھی اثر انداز ہوئے تو جدید ادب کی طرف رجوع میں ذرا ٹھہراؤ آ گیا اور پرانی ہیئتوں کی مقبولیت نے جدید ادب، خصوصاً شاعری، کے لیے نئے مسئلے کھڑے کر دیے۔ مگر یہاں جو جدید شاعر تھے وہ اپنی وضع کے پابند ہی نہیں رہے بلکہ اس میں نت نئے تجربوں سے اضافے بھی کرتے چلے گئے۔ بعض شعراء نے یہی

رنگ اپنایا۔ جدید ادب کے مقابلے میں ترقی پسند ادب اور نظم کی نئی ہیئتوں کے مقابل غزل کی اہمیت کے سوال اٹھائے گئے حالانکہ محض شعر ہیئت بدلنے سے جدید یا ترقی پسند نہیں ہو جاتا، یہ تو دل کے اندر کی بات ہے۔ اسی لیے جب میں نے یہ مسوّدہ دیکھا تو دفعتاً مجھے پچھلی صدی کی تیس اور چالیس کی دہائیاں یاد آئیں اور مجھے اِن نظموں میں وہ فضا نظر آئی جو حلقہ اربابِ ذوق لاہور کی نشستوں میں شعر پڑھتے یا سنتے وقت دکھائی دیتی تھی۔ اس مجموعے میں ایسی نظمیں نظر آئیں جن میں جدید شعراء کا اثر بھی دکھائی دیا اور اپنا انفرادی رنگ بھی پختہ نظر آیا۔

میں شعر یا شاعری کی کوئی حتمی تعریف نہیں کر سکتا۔ بہت کوشش کی، یہ دریا کوزے میں بند کرنے میں ناکام رہا۔ مگر شاعری کی خوشبو ضرور سونگھ لیتا ہوں اور ان نظموں میں مجھے شاعری نظر آئی۔ یار لوگوں نے شاعری کرنے کے لیے بڑے بڑے قاعدے اور قانون بنا رکھے ہیں مگر شعر کا کچھ اعتبار نہیں کہ وہ سارے قواعد کا پابند رہ کر بھی شعر نہیں بن پاتا اور کبھی سارے قانون توڑ کر بھی شعریت سے معمور ہوتا ہے جسے آپ پہچان تو سکتے ہیں مگر اسے کسی تعریف، کسی قاعدے کا پابند نہیں کر سکتے۔

جدید نظم میں صرف نظم معرّا اور نظم آزاد ہی شامل ہو کر بہت سے حلقوں میں پذیرائی حاصل نہیں کر رہی تھیں بلکہ نظم کی کئی اور جہتیں بھی مقبول ہو رہی تھیں۔ جدید شاعر نظموں کی ساخت پر بھی توجہ دینے لگے تھے۔ نظم کی ابتدا سے اس کے آخر تک اس کے ڈھانچے پر توجہ دی جانے لگی۔ نظموں پر اس زمانے میں جو تبصرے شائع ہوتے تھے ان میں سے بعض میں نظم کے ایک ایک مصرع کا جواز اور تاثر زیرِ بحث آتا تھا۔ کچھ نظموں میں دانستہ، یا نادانستہ طور پر کچھ باتیں کُھل کر نہ کی جاتی تھیں۔ ان باتوں کے صحیح مفہوم تک قاری کو خود پہنچنے کے لیے دعوت دی جاتی تھی۔ یہ کہا جاتا تھا کہ جہاں لکھنے والا اتنی محنت کرتا ہے وہاں پڑھنے والے کو بھی کچھ زحمت اٹھا کر تخلیقی عمل میں شامل ہونے کی لذت سے آشنا ہونا چاہیے۔ پھر نظموں میں جزئیات، علامات، اساطیر بھی شامل ہونے لگی تھیں۔ نظموں میں مصرعوں کی موسیقی اور صوتی تأثر کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ کچھ شعراء نے فرانسیسی شعراء خصوصاً بودلیئر، میلارمے، پال والیری، رامبو

اور پال ورلین کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان پر اور ان کی نظموں پر ادبی رسالوں میں سیر حاصل مضامین شائع کیے تھے جن کی وجہ سے ہمارے یہاں رمزیت مقبول ہوئی۔

مغربی شاعری میں نو بہ نو تبدیلیاں آتی رہیں مگر یہاں اردو میں رفتار برصغیر کی تقسیم کے بعد سیاسی مسائل کے باعث ذرا سست پڑ گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب محمد حسن عسکری نے اعلان کیا کہ اردو ادب میں جمود آ گیا ہے۔ لیکن یہ جمود تا دیر قائم نہیں رہا۔ نوجوانوں کے ایک گروہ نے تشکیلی لسانیات کے نام پر اس سفر کو پھر جاری کیا۔ انہوں نے خود کو الگ بتایا مگر دراصل وہ حلقہ اربابِ ذوق ہی کے نظریات کو لے کر آگے بڑھنے لگے تھے۔ پھر ساختیات کا زمانہ آ گیا جس کے اثرات یہاں پچھلی صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں پہنچے۔ مگر تابش کمال کی شاعری کو دیکھنے کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا پڑے گا اس لیے کہ ان کی شاعری بھی زیادہ تر اسی شاعری کی یاد دلاتی ہے جو حلقہ اربابِ ذوق کے اس زمانے میں لکھی جا رہی تھی جب یہ انقلابات یہاں جڑیں پکڑ رہے تھے۔

یہاں تک میں نے جدید شاعری کی ظاہری تبدیلیوں کے بارے میں بات کی، باطنی طور پر بھی نظم بہت بدل گئی تھی۔ قاری تک بات پہنچانے کا طریقہ صرف واضح بیان میں نہ تھا بلکہ نظم میں خیال کا اظہار تصویری پیکر (Images) کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ اشارے کنائے کو پہلے سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ بعض باتوں کا بظاہر آپس میں واضح تعلق نظر نہ آتا تھا مگر ذرا غور و فکر سے نہ صرف بات واضح ہو جاتی بلکہ وہ اپنا تاثر بھی بڑھا دیتی تھی۔ اور بھی کئی طریقوں سے مناسب شعری کیفیات پیدا کی جاتی تھیں۔

تابش کمال کی شاعری میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ اگر آپ ان کے کلام میں سے اس کی مثالیں ڈھونڈنا چاہیں تو وہ جا بہ جا مل جائیں گی۔ میں طوالت کے خوف سے مثالوں سے تو بات کو نہیں پھیلاؤں گا البتہ اشارے ضرور کر سکتا ہوں۔ دیکھیے ایک مصرعے میں کیا کیفیت پیدا کی ہے۔ مصرع ہے:

شگوفے پھوٹیں تو خون میں گیت بولتے ہیں

یا ذیل کے مصرعے دیکھیے:

میں کمرے میں آیا
تو بستر پہ لیٹی ہوئی رات کی سسکیاں
میرے احساس میں رچ گئیں
اور جو کرچیاں رات کے ہاتھ سے بچ گئیں
ان کو میں نے سمیٹا تو یہ نظم ترتیب دی

(آخری مصرعے میں نظم کو جو موڑ دیا گیا وہ دفعتاً قاری کو تفہیم کے نئے احساس سے چونکا دیتا ہے)

تابش کمال کی نظمیں بار بار پڑھی جا سکتی ہیں اور دل ان کو پڑھ کر ایک عجیب مسرّت حاصل کرتا ہے۔ کچھ نظمیں خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں مثلاً نئی خوشبو، خوں بہا کون دے، اوقات سے باہر، فنکار ہاتھ، مستقبل کا ایک منظر، کھیل کا سامان، اپنی سالگرہ پر، نئے دن کا نصاب اور خواب آباد۔ یہ نظمیں مجھے پہلی نظر میں پسند آئیں۔ ان میں سے ہر ایک تفصیلی گفتگو کی متقاضی ہے مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

چلتے چلتے دو ایک باتیں اور---ایک تو یہ کہ ان نظموں کو پڑھتے وقت کچھ دوسرے سینئر شاعروں کی طرف دھیان جاتا ہے۔ یہ بات بذاتِ خود اچھی ہے نہ بُری بلکہ اپنے عہد کے ادب سے ایک تعلق پیدا کرتی ہے۔ اس مجموعے میں نظم ''ساربان'' پڑھ کر ن۔م۔راشد کی نظم ''ایران میں اجنبی'' کی طرف خیال جاتا ہے جس کا کردار کچھ کچھ اس نظم کے ساربان سے مماثل ہے۔ اسی طرح نظم ''شاعروں کا جبر'' سے خیال ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی ایک نظم Love Song of J. Alfred Prufrock کی طرف جاتا ہے۔

یہ مجموعہ ایک نوجوان شاعر کی نہایت خوبصورت نظموں کا مجموعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قارئین میں مقبول ہوگا اور ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ضیاء جالندھری

21/مارچ، 2005ء

کویتا کہانی

دھوپ جنمی نہ تھی
دیوتاؤں کی لکھی ہوئی پوتھیاں
اپنے بستے میں رکھے ہوئے ایک لڑکا چلا تھا
چھما چھم برستا ہوا مینہ،
چھاجوں اترتی ہوئی دھوپ
قرنوں کے رستے میں آئی
شروعات میں نقطہ نقطہ سفر لفظ کے منطقے تک رہا
پھر پرندوں کی میٹھی کویتاؤں نے راہ کھولی
گگریا اٹھائے ہوئے پنگھٹوں پر جھکی گوریوں کی ہنسی
وصل کی روشنی، ہجر کی تیرگی
سانولی سطر تک آئی تو نظم چلنے لگی
دیوتاؤں کے لکھّے ہوئے شبد جی میں دمکنے لگے
گاؤں سے شہر تک، شہر سے گاؤں تک
کتنے جُھولوں کی کلکاریاں،
دائرہ دائرہ رقص کرتے بگولوں کی سِسکاریاں خوں میں اُتریں
مہاجر پرندے کویتاؤں کی داد دیتے ہوئے اُڑ گئے
گزرے چالیس برسوں کا حاصل یہ پوتھی ہے
یہ کچھ کویتائیں ہیں
تم جو چاہو پرندوں سے مل کر پڑھو

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال
www.darulkamal.com

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**

www.darulkamal.com

نظم فسانہ

نظم اب تک رواں ہے
اِسے دیومالاؤں نے لوریاں دیں
مذاہب نے گودوں کھِلایا
تھرکتے ہوئے وقت نے ساتھ چلنا سکھایا
چلی تھی کہ تاریخ نے اس کی انگلی پکڑ لی
بہت ہمسفر آئے لیکن پڑاؤ کو منزل سمجھ کر وہیں ٹِک گئے
رات آئی
(یگوں پھیلتی رات آئی)
مگر نظم چلتی رہی
اس نے کتنی زبانوں میں کتنے زمانوں کی باتیں بھی کیں
نیکیاں بھی کمائیں،
کئی وارداتیں بھی کیں

نیکیاں بہہ گئیں
وارداتیں سلاخوں کے اندر کہیں رہ گئیں
نظم اب تک رواں ہے
مِرے اور مرے جیسے کچھ شب زدوں کی زباں ہے
لہو میں، کسی آنکھ میں، جھونپڑی میں، شگوفوں میں، سسکار میں
نظم اب تک رواں ہے

ساربان

کھجوروں سے مہکی ہوئی شام تھی
شُتر پر مال واسباب تھا اور میں اک سرائے کے در پر کھڑا
رات کرنے کو اک بوریے کا طلب گار تھا
ٹمٹماتی ہوئی شمع کی لَو میں ابنِ تمامہ کا سایہ
(جو ماحول گھیرے ہوئے تھا)
اُسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ روشنی پھانکتا ہو
قوی الجسامت،
حریص آنکھ سے لحظہ لحظہ ٹپکتی کمینی خوشی،
بھاؤ تاؤ میں چوکس
عصا اور لٹکی ہوئی ریش
(دو اژدہوں کی طرح

وہ سرائے کی گندی فضا کو مہکتا ہوا خُلد کہتا
مسافر درم اور دینار دے کر وہاں خواب کرتے
مجھے اُمِ لیلیٰ کی فرمائشیں کھا گئی ہیں
زمانے کا شُتر آن پہنچا ہے ایسے کنوؤں تک جہاں تیل ہے
میں مگر
آج بھی اس سرائے میں ابنِ تمامہ سے باتیں کیے جا رہا ہوں
ابھی اُمِ لیلیٰ کی کچھ حسرتیں اور بھی ہیں

آؤ

کہیں سے تم مجھے آواز دیتی ہو
غبارِشام کے بے عکس منظر میں ہوا کی سائیں سائیں
پنچھیوں کو ہانکتی ہے
دُور چرواہے کی بنسی میں ملن رس کا سُریلا ذائقہ ہے،
رات رستے میں
کہاں سے تم مجھے آواز دیتی ہو!

مسلسل آہٹیں میری سماعت ہی نہ لے جائیں
بچا رکھے ہوئے آنسو کہ بینائی ٹپکتی ہے
اُنہی لفظوں کی لَو میں رات کٹتی ہے جنہیں آنکھوں نے تصویرا
شبِ وعدہ کی سنگینی روایت ہے
مِرے امروز کے چُولہے میں بھی اب تک وہی ایندھن
بھڑکتا ہے

سو پابندِ روایت ہوں
اگر آواز دیتی ہو
تو آؤ صبح کے ساحل کو چلتے ہیں
لہو میں کسمساتے قہقہے ہونٹوں تک آنے دو
مجھے بھی مسکرانے دو

طوفان کے بعد

رات در کھٹکھٹاتی ہوئی آئی
اور چٹخنی جب گری تو صدا دُور کُتّوں کی بھونکار میں مل گئی
چاند نے ایک غوطہ لگایا
پھر اک شاخِ زیتون کی اوٹ سے جھیل کی سمت تکنے لگا
کھِلکھِلاتے کنول
ایک دُوجے میں پیوست سرگوشیاں کر رہے تھے
ہوا سر کے بل گھومتی،
رات لمبے شجر کے گھنے سائے کو گھورتی تھی

مَیں کمرے میں آیا
تو بستر پہ لیٹی ہوئی رات کی سسکیاں
میرے احساس میں رچ گئیں
اور جو کرچیاں رات کے ہاتھ سے بچ گئیں
ان کو میں نے سمیٹا
تو یہ نظم ترتیب دی

نئے دن کا نصاب

رات کے قافلے سے اُدھر اک دمکتی ہوئی صبح ہے
مُردہ تاروں کی پھیکی ہنسی،
چاند کا زرد افسوں،
ہَوا کے سلگتے ہوئے بین، ہستی کا آخر نہیں
صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے شفق، سرمئی گھر کے آنگن سے
نکلے گی سُرخی لگائے ہوئے،
سوئی آنکھیں نئے دن کو خوش آمدیدی دعائیں کہیں گی،

گُل و برگ دف کی صدا پر تھرکتے ہوئے
رنگ و خوشبو کے نغمے الاپیں گے،
شبنم گُہر کے خزانے نچھاور کرے گی،
صبا جشن ترتیب دے گی
وہ سورج (گئے دن کے سورج کا وارث)
نئی تاب سے تختِ مشرق پہ بیٹھے گا
آہستہ آہستہ رتھ چھچھوں کے جلو میں بڑھے گا، ہماری طرف
اُڑتے پھرتے پرندے اسے دیکھ کر
آسمانوں سے غوطے لگائیں گے
گویا سلامی کو جُھک جھک گئے ہوں
کہیں سبزہ جاگے گا اور دھوپ کا گھونٹ بھرنے
فلک کی طرف منہ کیے سانس لینے لگے گا

ہَوا کے سلگتے ہوئے بین ہستی کا آخر نہیں
نغمہ گر اپنے الفاظ میں روشنی کے ترانے لکھیں گے،
صبا کی ثنا میں قصیدے کہیں گے

شبِ جبر کتنی ہی پھیلے
مگر ایک خورشید کے فاصلے پر ہے ہنستا ہُوا روزِ روشن
وہی دن ہماری کتابوں،
ہمارے نصابوں،
ہمارے لہو میں رواں ہے

شام ڈھلے

چلو نا!
صبح کے ساحل پہ بیٹھی زندگی آواز دیتی ہے
لہو میں سنسناتے سُرمئی جاڑے گئے،
بادِ بہاری کی سواری آن پہنچی ہے
ہوا اِملی کے پیڑوں میں چھپی چٹخارتی ہے
دُور دیسوں کے مہاجر طائروں کے زمزموں سے شام روشن ہے
کوئی بھولا ہُوا وعدہ!
کوئی آدھا تبسّم، جس کی تابندہ مہک سے رات روشن ہو

گئے برسوں کی پتھریلی مسافت

پاؤں میں چھالے، نظر میں گرد اور بالوں میں چاندی بھر گئی ہے

اس پڑاؤ میں تھکے ہارے مسافر

اپنے تکیوں میں دلاسے رکھ کے سوتے ہیں

رُتیں اس لمس کو دہراتی ہیں جو وقفۂ بادِ خزاں میں کھو گیا تھا

شام ڈھلنے پر

چلو نا!

اس دھندلکے میں وہاں جائیں

جہاں دن رات اور ملنا بچھڑنا ایک جیسا ہے

ایک بزرگ شاعر پرندے کا تجربہ

عزیزو!

اگر رات رستے میں آئے

اگر دانہ و دام کا سحر جاگے

اگر اُڑتے اُڑتے کسی روز تم آشیاں بھول جاؤ

تو پچھلی کہانی میں موجود جگنو سے دھوکا نہ کھانا

کہانی، نہیں دیکھتی غم کے نم کو

کہانی نہیں جانتی کیف و کم کو

کہانی کو وہم و گماں کی کٹھن راہ سے کون روکے

کہانی کا پیرایہ خواہش کا قیدی نہیں
پیرہن کوئی بدلے تو بدلے،
کہانی بدلتی نہیں ہے

عزیزو!
اگر رات آئے تو رستے میں پڑتی
مِری جھونپڑی کا دِیا دیکھ لینا
میں خود اُڑتے اُڑتے یہیں پر گرا تھا

بات کی دھار

تم نے کچھ عہد کیے تھے انہی کُہساروں میں
برف زاروں کی تہوں میں اب تک
اپنی باتوں کی تپش زندہ ہے
ایک عرصہ دبے رہتے ہیں تہِ خاک یہ بیج
اوپر اوپر ہی برستی ہیں گھٹائیں، بے فیض
نمِ زیست ان تلک آتا ہی نہیں
بعض اوقات کوئی مونس دھار
قطرہ قطرہ بدنِ خاک میں یوں گرتی ہے
کہ کسی بیج کا نم جاگتا ہے

اک نہ اک دن کسی احساس میں لہراتی ہے
بات ہو یا کوئی غمخوار سی دھار
یہی امکان مجھے لایا ہے
ان پہاڑوں میں شرارے ہوں گے
تم نے کچھ قول............

رات، سورج اور گُم نظم

شبِ بے ماہ میں آوارہ ستاروں کی جلن
دل کسکتا ہے
مگر نظم نہیں بن پاتی
اتنا بے مہر فسوں ہے
کہ یہ سنّاٹا بھی رگِ جاں کاٹتا ہے
یہ ہیولے ہیں کہ آسیب ہیں
ان پیڑوں کے
جن کی شاخوں کی طراوت میں لہو بڑھتا تھا

ان پُر اسرار گزرگاہوں سے
آج اگر ثابت و سالم گزروں
کل کا خورشید مِری راہ میں حائل ہوگا
شب کا حاصل ہے سلگتا ہُوا، تپتا ہُوا دن

اپنے آئندہ کی تمہید بندھے
کوئی امید بندھے ابر بھرے دن کی،
سیہ رات میں مہتاب کے لہرانے کی
بے نمو آئنہ چشم میں کچھ نقش بنیں
(کوئی مکمل نہ سہی)
ہاتھ اگر ہیں تو شباہت بھی ابھر آئے گی

ناامیدی میں نہ جی پاؤں گا
کوئی ریلا کہ یہ رستے میں کھڑی سنگ کی دیوار ہٹے
لفظ محرومِ معانی نہ رہے
نظم مکمل ہو جائے

Dimensions

وہی بہار و خزاں ہے مجھ میں بھی،
مجھ سے باہر بھی
(آدمی سے الگ نہیں ہوں)
شگوفے پھوٹیں تو خون میں گیت بولتے ہیں
کبھی کبھی خار کی کھٹک ٹیس بن کے ہونٹوں سے جھانکتی ہے

نجانے کتنے ہی گیت تھے جو بہار سے پہلے
شاخ کی رگ میں جی رہے تھے

جڑوں کا بُخل ان کو کھا گیا ہے
یہ خار، سوتیلے بیٹے شاخوں کے
ان تک آیا نہیں ہے نم
پھر بھی جی رہے ہیں
(چمکتے سورج کا سارا سچ ان کے بطن میں ہے)
تپش کی شدت کو پی کے سُوکھے سڑے ہوئے ہیں
یہ جی رہے ہیں

مجھے خزاں اور بہار کے رابطوں میں جینا ہے
پھول کا التفات، کانٹے کے تلخ طعنے
مِرے حوالے ہیں
جڑ کا نم، آفتاب کی تَب
مِرے ہنر میں ہی بولتی ہے
میں کتنی سطحوں پہ جی رہا ہوں

کبھی کوئی پھول مسکرائے
کبھی کوئی خار دل دُکھائے
تو مجھ تک آنا
یہ نظم دونوں کا ماجرا ہے

شاعروں کا جبر

چائے کی بھاپ میں
گُھلتے ،معدوم ہوتے ہوئے قہقہے شام کا بانکپن
کوئی مصرع دھوئیں کے بگولوں میں کمپوز ہوتا ہُوا
کوئی نکتہ جو اسرار کے گُھپ اندھیرے سے شعلہ صفت سر اُٹھائے
عجب دھیما دھیما نشہ اختلافات کا
اپنے نچلے سُروں میں کوئی فکر مربوط کرتا ہُوا زاویہ
طنز کے ناوکِ خوش سلیقہ کی سَن سَن
ہواؤں سے محفوظ سانسوں میں آراستہ مختلف سگرٹوں کی مہک
شام کے سرمئی بانکپن میں کسی کوٹ ، مفلر، سویٹر سے اُٹھتی ہوئی
خوشبوئے آشنا
جوڑتی ہے ہمیں اک سمے سے جو مدّت سے
اک نا ملائم زمانے میں محکوم ہے
کون لمحے کو واپس بلائے ،
سمے کو مکمل کرے

اپنی نظمیں اسی اک تسلسل زدہ دائرے میں ہیں
پُر کار جن کی رہائی پہ مائل نہیں
ریستورانوں کے کونوں میں سہمی ہوئی
کتنی شاموں کا جادو یہاں سطر در سطر محبوس ہے
ہم جو قیدِ زمان و مکاں سے نکلنے کو پَر مارتے ہیں
بھلا شام ڈھلنے پہ الفاظ کے پنچھیوں کو جکڑتے ہیں کیوں
دامِ تصویر میں
یہ بگولے، دھواں، بھاپ اسیری کے عادی نہیں
شام خود رات کی گود میں جا کے گِرنے کو بے تاب ہے

بے گھری

خواب کی سلطنت سے ادھر
اک جہاں ہے جسے آنکھ آباد کر لے تو کر لے
وہاں سائے ہی سائے ہیں
اکثر و بیشتر دھوپ میں رقص کرتے ہوئے
ریز گاری کی آواز پر دھڑکنیں تال دیتی ہیں تو جھلملاتے ہیں
آنکھوں میں خواب
(اپنا گھر اس کے دارالخلافے میں ہے)

صبح سے شام تک

نوٹ گنتی ہوئی انگلیاں یوں تھرکتی ہیں
جیسے تمناؤں کو تھپکیاں دے شبِ ہجر میں ایک برہن کا دل
روز خوابوں کی پونجی میں سِکّوں کے گرنے سے اک گونج اٹھتی ہے
گویا کہیں ٹین کی چھت پہ بارش کے قطرے پڑیں
روز اک گھر تمنا کے ملبے سے آنکھوں کے پاتال میں جھانکتا ہے
وہی بے گھری، بے زمینی کا دکھ آج تک مجھ کو گھیرے ہوئے ہے
میں چاند اور سورج کی صورت فلک در فلک تیرتا ہوں
مِرے خواب مجھ کو اُڑائے لیے جا رہے ہیں
میں پامال ہوتی ہوئی آرزو میں کہاں تک جیوں گا

آج تک

اُس کی آنکھوں کی ریشمی جھالر
اب بھی پلکوں پہ جھلملاتی ہے

رات کے بے کراں اندھیرے میں
ایک لَو دُور ٹمٹماتی ہے

دُھول اُڑتی ہے خواب زاروں میں
دل میں تنہائی بیٹھ جاتی ہے

کون جانے کہ یاد کی بدلی
کس کو سیراب کرنے آتی ہے

آج بھی خواہشوں کے آنگن میں
ایک پرچھائیں سَرسَراتی ہے

ہَوا سے کہہ دو

وہ سبز بیلیں جو سرو در سرو دوڑتی تھیں
وہ تتلیاں جو گلاب اندر گلاب رقصاں تھیں
اب نہیں ہیں
صبا تو کب کی نکل گئی ہے
پرند، پنچھی نئے دیاروں کو جا چکے ہیں
درخت گُھٹ گُھٹ کے مر رہے ہیں
وہ بانسری کی حسین لَے خواب ہو گئی ہے
جگہ جگہ مُردہ آرزوؤں کی ہڈّیاں ہیں
ہوا سے کہہ دو کہ آئے اور مملکت سنبھالے
ہوا کا ماحول بن چکا ہے

کہانہیں تھا

کہانہیں تھا سفید فامی کا ناز لے ڈوبتا ہے آخر
زمیں سیاہ وسفید کو مانتی ہی کب ہے
کہ غرب سے شرق تک یہی آفتاب کرنیں بکھیرتا ہے
یہی تمہارے سروں پہ چمکا
مگر تمہارے مزاج کی برف اسی طرح ہے
مہیب غاروں سے اونچے محلوں تک آ گئے ہو
تو کیا
کہ جنگل سے جال میں آ کے بھی تمہارا وہ بھیڑیا پن اسی طرح ہے

زمین کی کوکھ میں جو بارود بو رہے ہو

اسے کسی روز کاٹنا ہے

غلام رکھنے کی رسم تو ڈیڑھ سو برس پاس کا ہے قصّہ

وہی براہیم لنکن اب تم پہ تھوکتا ہے

جسے ہر اک آدمی کا غم تھا

تمہاری موجودگی میں لوتھر کے خواب ایندھن بنے ہوئے ہیں

تم آگ پر تیل ڈالتے ہو

یہ تیل تم جس کی آرزو میں ہمارے ساحل تک آ گئے ہو

کہا نہیں تھا

ہوس کا ساحل کہیں نہیں ہے

تم اپنے لوگوں کی ہڈیاں تو چچوڑتے تھے

مگر مشینوں کے منہ میں کوئی زباں نہیں تھی (زباں نہیں ہے)

تمہارے ہاں عورتوں کے احوال سے جہاں بے خبر نہیں ہے

تمہارے بوڑھے الگ مکانوں میں چیختے ہیں

جنابِ عیسیٰ نے رشتوں ناتوں کو دائمی سچ نہیں کہا تھا؟

کہا نہیں تھا

زمیں کے سینے پہ آگ کے کرتبوں سے باز آؤ

اپنی زنجیر لو، پلٹ جاؤ

آدمی کا مزاج آزاد ہے

غلامی بُری بلا ہے

صلیب کے معرکوں کو پھر سے جگانے والوں کا زعم

اب ٹوٹنے لگا ہے

کولمبس اک اور خطۂ آرزو کی دُھن میں نکل پڑا ہے

کہا نہیں تھا............

خواب آباد (۱)

وہ بچّہ کہاں ہے!
جو جھولے میں لیٹا ہوا چاند کی گیند کو دیکھتا تھا
وہ اٹھتا مگر اس کا سَر دھم سے نرمیلے تکیے پہ گرتا
وہ پھر گیند کو دیکھتا، اس کی جانب لپکتا
اسی آن میں خواب اترتے
کوئی لمس گھیرے میں لیتا تو کتنے ہی چاند آنکھ میں آ ٹھہرتے

وہ بچّہ کہاں ہے!

جو ٹب میں کھڑا، ماں پہ چھینٹے اُڑاتا

اگر سر پہ پانی کی دھار آ کے پڑتی تو سانسیں الٹتیں پلٹتیں

مگر اک مسیحا کے ہاتھ اس کو محفوظ رکھتے

کبھی تولیے سے بدن پونچھتے ہاتھ میں گدگدی جاگتی

تو ہنسی سُن کے چڑیاں چہکتیں

سلائی سے سرمہ ذرا بھر کھٹکتا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے

مگر روئی آنکھوں کے شفّاف ڈورے

چمک میں فزوں ہوتے جاتے

عرق اور خوشبو عجب سحر کرتے

طراوت غذا کی طلب تک پہنچتی تو وہ ماں کی چھاتی سے

سیراب ہو کر دوبارہ اسی خواب آباد میں جا پہنچتا

وہ بچّہ کہاں ہے!

جسے لڑکیاں، عورتیں، نوجوان اور بوڑھے

سبھی چومتے چاٹتے گال پر کاٹتے

اس کی کلکاریوں سے ملائک میں اک لہر اٹھتی

لبوں پر ٹکی دودھ کی بوند ایسے مچلتی کہ جیسے شفق میں

کوئی مرمریں آفتاب

اس کے کنگھی کیے بال ریشم پہ اک طنز تھے

ایک معصوم حیرت سے سب کی طرف دیکھتا وہ فرشتہ

شناسائی کے اوّلیں دور میں تھا

وہ بچّہ کہاں ہے!

خواب آباد (۲)

وہ بچّہ کہاں ہے!
وہی باپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے اسکول جاتا ہوا
جس کی ٹائی ہواؤں سے کرتی تھی اٹھکھیلیاں
جس کے بستے میں ہر رنگ کی
کاپیاں، پنسلیں اور کتابیں بھری تھیں
کہیں رنگ ڈبیا میں لیٹے ہوئے ہنس رہے تھے
ربڑ ایک گوشے میں بیٹھا ہوا اک غلط حرف کو گھورتا جا رہا تھا

سماعت میں پنسل تراش اک رگڑ گھولتا تھا

وہ بچّہ کہاں ہے!

جو نظمیں، ترانے سناتا تو اک توتلا پن فضا پر عجب سحر کرتا

بڑوں اور بوڑھوں کے ہونٹوں پہ مسکان سی تیر جاتی

سوال اس کے ہونٹوں کے شہد اور شکر میں نہا کر نکلتے

کبھی کوئی استانی کچھ پوچھتی تو وہ معصوم لہجے میں الفاظ ترتیب دیتا

جنہیں سن کے استانی اپنی شرارت میں پھر پوچھتی

پھر نئے لفظ اس توتلے پن میں رخشندہ ہوتے

ہنسی اپنے فوّاروں میں کھِلکھِلاتی

وہ بچّہ کہاں ہے!

جو گیند اور بلاّ اُٹھائے ہوئے

اپنے ہم سِن فرشتوں کے ہمراہ میدان کو جا رہا تھا

وہاں میچ تھا اور جذبے کی آنچ اس کے گالوں میں دہکی ہوئی تھی

مخالف کی پھینکی ہوئی گیند کو پیٹتا،

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

تالیوں کی صداؤں میں بَلّے کو اوپر اٹھاتا ہوا
کپ، ٹرافی پہ بوسے جماتا ہوا
دوستوں میں گھِرا سیب، کیلے، سموسے اُڑاتا ہوا
معرکہ جیت کر جھومتا جھامتا اپنے اسکول سے گھر کو جاتا ہوا
وہ فرشتہ،
وہ بچّہ کہاں ہے!

اپنی سالگرہ پر

گئے برسوں کا حاصل کیا!
فقط اک موم بتّی تین سو پینسٹھ دنوں میں
کیک کے زینے پہ چڑھتی ہے
ذرا سی پھونک پر ہمراہیوں کے ساتھ بجھتی ہے
دھواں چکرا کے روشن دان سے باہر نکلتا ہے
چھری کی دھار سے کتنے برس کاٹوں!

ہوا کا آشنا چہرہ مری آنکھوں میں رہتا ہے
گئے لمحوں کو دہراتی ہوا طرزِ محبت ہے
وہ آئے تو نئے لمحوں کی رسّی تھام کر چل دوں
کہیں اندر رُکی پھونکیں لبوں تک آئیں
تو یہ بتّیاں گُل ہوں
ابھی کل کے دریچے کُھل نہیں پائے
مناظر دھند میں ہیں
آنسوؤں سے دُھل نہیں پائے

نئی خوشبو*

ابھی وہ بولتی کم ہے
فقط مبہم سے کچھ الفاظ
کانوں میں اترتے ہیں
زباں کا توتلا پن حرف کو تصویر کرتا ہے
کئی باتیں لہو کو گدگداتی ہیں
پرانے لفظ رشتوں کو نئی پہچان دیتے ہیں

* 'اُجالا' کے لیے ایک نظم

وہی بابا، وہی دادو، وہی دادا

جو صدیوں سے ہمارے ساتھ ہیں

ان مرمریں ہونٹوں سے نکلیں تو

نئی خوشبو بناتے ہیں

زباں کے زاویے

بنتے، بگڑتے، ٹوٹتے ہیں

لفظ ڈھلتے ہیں

ابھی وہ بولتی کم ہے

مگر الفاظ اس کے ہونٹ پر آ کر

نیا مفہوم دیتے ہیں

مستقبل کا ایک منظر

عجیب رُت ہے
گلاب کے شاخچوں سے چمٹی ہر ایک تتلی مری ہوئی ہے
تمام تاروں کا نُور گویا نچُڑ گیا ہے
وہ چاند جس کی سفید لَو میں لہو مچلتا تھا
آج کی شب کفن لپیٹے ہوئے پڑا ہے
ہَوا کی اٹھکھیلیاں کوئی سحر لے اُڑا ہے

عجیب رُت ہے
پرندے چلنے لگے ہیں اور سانپ اُڑ رہے ہیں
تمام چڑیوں کو ماس کی چاٹ لگ گئی ہے
تھکے ہوئے شیر اپنے غاروں میں بیٹھ کر گھاس کھا رہے ہیں
درخت پر ماس اُگ رہا ہے
عجیب رُت ہے
قلم سے الفاظ کی بجائے عجیب بے ربط سی صدائیں نکل رہی ہیں
جو کوئی بولے تو حلق سے بھونک جھانکتی ہے
پرندے چونچوں کے دائروں میں قلم دبائے زمین پر لفظ کھینچتے ہیں
نجانے کیسی مہیب رُت ہے
عجیب رُت ہے

تم یہیں ہو

میں لہلہاتی ہوئی نظر میں بہارِ رفتہ کو دیکھتا ہوں
گزر چکے پھول، اڑ چکی تتلیاں ان آنکھوں سے جھانکتی ہیں
یہ گُنجِ لب ہے کہ گا چکے طائروں کا مسکن!
یہ سانس جس میں گئی صبا کی مہک بسی ہے
اس ابر کی بھیگ اس کی باتوں میں بولتی ہے
جو پچھلے موسم برس نہ پایا
اداس راہیں، گئی بہاروں کا آئنہ ہیں
مِری متاعِ ہنر میں رفتہ جہاں بسے ہیں
خزاں کی رُت میں بہار کا یہ چراغ البم
سکوت کی لَو سے کھیلتا ہے

خود سے

خواب ور! کہکشائیں دے ترتیب
آنکھ میں روشنی کی چادر بُن

کوئی میٹھے دنوں کے سُر لے کر
اِن دیوں کو سُنا دمکتی دُھن

پھر کوئی بے ریا جہان بنا
تیرے ہاتھوں میں ہے کلیدِ 'کُن'

یوں نہ تنہائیوں میں کروٹیں لے
یوں نہ اپنے خیال میں جل بھُن

باندھ الفاظ میں نئے معنی
کبھی اپنے لہو کی بانی سُن

سونامی

............اور اب تو خشک وتر کے درمیاں کھینچی لکیریں بھی نہیں

پانی ہی منصف ہے

کوئی ساحل نہیں

ہر سمت بس موجیں ہی موجیں ہیں

ہمارے ہاتھ نے دھرتی پہ جو حرفِ غلط لکھا،

جو فصلِ کینہ ہم نے بوئی تھی

سب لے گیا پانی

یہ سطحِ آب پر بہتے ہوئے لاشے ہمارے وہ تصور ہیں
جنہیں انسان سے انسان کی دوری نے جنما تھا
سخی لہروں نے جسموں سے وہ سارا زہر چُوسا،
سُرخ دھرتی پر بچھا ڈالا
کئی صدیوں سے فاقہ کاٹتے گدھ اور کوّے خوش!
اگر اب پھر کوئی دیوار انسانوں میں اُٹھّی،
زندگی نے سرحدیں کھینچیں
تو کوئی بھی نہیں ہوگا جو کہہ پائے
فقط پانی ہی منصف ہے

وہ

اس کے جُوڑے میں ہنستے ہوئے پھول نے کچھ ہوا سے کہا
کوچہ کوچہ مہکتی ہوا گنگناتی ہوئی بادلوں سمت بڑھنے لگی
پہلا قطرہ چلا
اور لہرا کے رخسار پر آ گرا
پھول پر اوس کا دیپ ہنسنے لگا
ٹکڑیوں ٹکڑیوں گھومتے بادلوں میں عجب ایک ہلچل ہوئی
اپنا اپنا ہدف ڈھونڈتے ڈار آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے
اس کے ہاتھوں کے پیالے میں گرتا ہوا آسماں رس
کناروں سے

اوک میں وہ متاعِ فلک تھام کر جانے کس رخ گئی
آسماں پانیوں سے تہی اور حیران
خشکی کی سُولی اٹھائے ہوئے جل رہا ہے
ستارے، دہکتے ہوئے کوئلے
چاند، آتش کا گولا
کوئی آنکھ جس میں نمی رہ گئی ہو،
اگر ہو سکے،
اس کے پیالوں میں جکڑے ہوئے بادلوں کو چھڑائے
زمیں اب تڑخنے لگی ہے
اگر کوئی ہنستا ہوا پھول ہے تو............

دیو مالائیں سچی ہوتی ہیں

گھڑی دو گھڑی کی مسرّت
یہ صدیوں پہ پھیلا ہوا دیو مالائی قصّہ ہمارے لہو میں رواں ہے
کسی گھونسلے میں سے انڈے چراتا ہوا سُورما
ایک چیتے سے گُر سیکھتا کوئی بچہ
کماں کھینچتا اور مادہ کو ناوک سے نیچے گراتا ہوا،
آگ دریافت کرتا ہوا کوئی لڑکا

عجب صورتیں ہیں

شبِ داستاں گوئی صدیوں پہ پھیلی ہوئی ہے
ہَوا مرغزاروں کی یخ بستگی میں نہیں رہ سکی
سو یہاں آ گئی ہے کہ اپنا بدن گرم کر لے
یہ آگ اب جبلّت کی ترتیب کا لازمہ ہے
بہیمانہ خصلت کو تسکین دیتا ہوا ایک عنصر
ہَوا دیومالاؤں کے دَور کی ایک بڑھیا ہے
جس کو ہر اِک داستاں یاد ہے

یہ گھڑی دو گھڑی کی مسرّت
جسے داستاں گو کی باتوں سے ہم نے کیا ہے کشید
ایک دن آئے گا جب ہَوا اپنے قصے میں وہ صورتیں لائے گی
جن کا آئینہ ہم ہیں
شبِ داستاں گوئی میں ہم جو مبہوت و حیران بیٹھے ہوئے
داستاں سُن رہے ہیں
کبھی ایک ٹھٹھری ہوئی رات میں ہم کہانی کا مرکز بنیں گے

جو بچّے عدم ہیں
ہمیں داستاں میں گھِرا دیکھ کر کھِلکھِلائیں گے،
مبہوت و حیران ہوں گے

دیس بدیس

کرنیں ناچ رہی ہیں

مُدّت بعد آئی ہے گھر میں اک پردیسی چاپ
آنکھوں میں صحرا کی وحشت اور سانسوں میں بھاپ
مال اور زر کچھ ہاتھ لگا تو کھو گیا اپنا آپ
کرنیں ناچ رہی ہیں

بیس برس کی برہن کیسے ہار سنگھار کرے
گبھرو بیٹوں والی کیونکر الھڑ پیار کرے
سوچ رہی ہے کیسے دکھ کا دریا پار کرے
کرنیں ناچ رہی ہیں

دو ہفتوں کی چھٹی لے کر ساجن گھر آیا ہے
در در چھانی خاک اور آخر اپنے در آیا ہے
بیس برس کا بچھڑا ڈھولا کیا لے کر آیا ہے
کرنیں ناچ رہی ہیں

اپنے ہونے کی تصدیق

بہار آ گئی ہے
اُن آنکھوں کے پیمان کو یاد کرتے ہوئے
جھکتی پلکوں کی شب جھالروں کو لبوں سے اُٹھاتے ہوئے
اُس حنائی ہتھیلی کو تشبیہہِ مہتاب دیتے ہوئے
پھر بہار آ گئی ہے

ہنسی، گُل کے فوّارہ جذبوں کو جُھولا جُھلاتی ہوئی،
رنگ، بادِ صبا کو عجب طور سے تنگ کرتے ہوئے،
شاخچوں پر اُگے طائروں کی گلابوں سے چشمک،
لبِ آب جُو آفتابِ ضیا پاش کی نرم کرنوں کا دام
اُس تسلسل کا پھیلاؤ ہے
جو خزاں نے کسی وقفۂ گُل میں توڑا

کنول پھر مہکنے لگے ہیں
مراجع ہُوا ہے گُلِ آفتاب اپنے مقصود کی اور
لہروں میں بھنوراتے سیپ اپنے باطن میں اسرار لے کر
تہِ آب چُھپنے لگے ہیں

بہار آ گئی ہے
تمنّا کے ممکن میں سرگوشیاں کسمسانے لگی ہیں
اُن آنکھوں میں اپنے لیے شاید اِک آدھ موتی بچا ہو
گُلِ نیلمیں آرزو کی سَجل روشنی میں دہکنے لگا ہے

میں پھر اپنے ہونے کی تصدیق کرنے
ان آنکھوں کے گھیرے میں ہوں
شامِ وعدہ لہو میں مچلنے لگی ہے
شفق چھا گئی ہے
بہار آ گئی ہے

گونج کی بات

آرزو گونجتی ہے
ہر طرف پھیلے پہاڑوں کی فضاؤں میں کہیں
مدُھر آواز کسی بنسی کی
کسی بہتے ہوئے چشمے کا ملائم سنگیت
ایک جھرنے کی طرح گرتے ہوئے سنتا ہوں
کہیں سُر کان میں پڑتے ہیں
کہیں ٹپ، ٹپ، ٹپ
اِک چھناکے کا بھی ہلکا سا گماں ہوتا ہے
مجھ پہ معنی نہ کُھلے بہتے ہوئے پانی کے
جانے کیوں بھیگتی جاتی ہیں یہ پاگل آنکھیں

یہیں کھویا ہے وہ مہتاب
یہیں چاندنی پیڑوں کے تلے قتل ہوئی
ایک تو رات کا غم ناک فسوں
دوسرا گزری ہوئی باتوں کی گونج
ان پُراسرار پہاڑوں میں کہیں
چیڑھ کے پیڑوں سے ٹکرا کے ہوا
اس طرح سیٹی بجاتی ہوئی کھو جاتی ہے
جس طرح کوئی نگہ دار شبِ تیرہ میں
نیم خوابی میں 'خبر دار، خبر دار' کہے

اپنے خلاف

مری ہوئی مچھلیوں کی بُو ئے نجس اُٹھائے
ہَوائے بے اعتبار چوکھٹ تک آ گئی ہے
ہر ایک جانب میں پَر نُچی فاختاؤں کے بین گونجتے ہیں
سفید پرچم پہ زمزمہ خواں پرند کے پنکھ، گالا گالا
یہاں وہاں اُڑتے پھر رہے ہیں
کنواریوں کے لہو میں لتھڑی ہوئی فصیلوں پہ
رات کا بُوم بولتا ہے

دیارِ حرمت میں جل بجھے جسم

آنسوؤں کی دبیز تہہ میں اب ان مزاروں کو دیکھتے ہیں

جہاں پہ صدیوں سے سُرخ پوشانِ دین گُم ہیں

مراقبوں میں

خدائے برتر! ہَوا نہ آئے

ہمیں وہ حَبس اس ہَوائے نامہرباں سے بہتر ہے

جس میں سانسیں الجھ رہی ہیں

ہوائے کم اعتبار میں ایسی بُو رچی ہے

سگانِ کوچہ ہماری چڑیوں پہ بھونکتے ہیں

قصّۂ شب

سُرخ آنکھیں گھماتے ہوئے بھیڑیے رات کا حُسن ہیں
سَرسَراتے ہوئے شاخچوں میں چُھپے ماندہ پنچھی،
مُصلّے پہ بیٹھے ہوئے ریش دار اہلِ باطن،
پنگھوڑے میں کلکارتے نُور چہرے،
یہ بستر بدلتی ہوئی لڑکیاں،
زہر اُگلتے ہوئے سانپ،
دیوار پر جست کرتے ہوئے سائے،
لڑتی ہوئی بِلّیاں
رات کا حُسن ہیں

اپنے سر پر یہ صدیوں سے پھیلا ہُوا بے مہ و نجم گردوں
سرِ شام رنگ اپنا تبدیل کرتا ہے تو رات کا آئنہ جاگتا ہے
اندھیروں بھرے آئنے میں صدائیں ہیں، صورت نہیں
سامعہ شکل ترتیب دیتا ہے
سُنتے ہوئے جگمگاتے ہیں آواز کے خال و خد
میں نے سرگوشیوں، قہقہوں، منتروں، آہٹوں
اور آہوں میں دیکھا ہے حُسن
ایک پیرائے میں سَر اُٹھاتی ہیں عُزّ اہٹیں، وصل آثار سانسیں
یہ پلکیں جو آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی ہیں
شفق جو اندھیرے میں گُھلنے لگی ہے
یہی رات کا حُسن ہے
رات آنکھوں میں ہے

خوں بہا کون دے

کہاں جائے مصرعوں میں الجھا ہُوا دل!
ہر اِک سمت اعداد کا شور ہے
لال، نیلے، ہرے کاغذوں کی کھڑ اکھڑ میں الجھے ہوئے کان،
جھنکار ترسی ہوئی سبز آنکھیں،
بٹن پر ٹکی لالچی انگلیاں،
کچھ بھی میرا نہیں
کوئی میرا نہیں

چمچماتی ہوئی گاڑیوں کے گزرنے سے اُٹھتی ہوئی گرد کا ذائقہ
کیسے مصرعے کی گُل قند کو راستہ دے
کھڑا کھڑ کی لو بھی رُتوں میں بھلا کون مصرع سُنے
رات کی آخری ساعتوں میں
لہو میں مچلتا یہ آہنگ ہونٹوں تک آئے تو کیسے
اِسے بہری بستی میں گویائی کا خوں بہا کون دے گا!

بستی کہ بَن ہو

یہاں میرے اجداد کی روشنی ہے
سرِ شام وہ مرقدوں سے نکل کر مِری سمت آتے ہیں
اُن کے ہیولے
مِرے ساتھ شب تک ٹہلتے ہیں
لیکن یہاں سے چلا جاؤں گا
لَو میں لشکارتا میرا قصبہ مِری بے گھری لکھ چکا ہے
مخالف ہوا سنسنانے لگی ہے
یہاں کل کا خورشید ہجرت کی گٹھڑی اٹھائے مِرے در تک آئے گا
میں اِک مصلّٰے، قلم اور تسبیح لے کر چلا جاؤں گا
مجھ پہ لازم ہے اُس نور کی پیروی
جس کو مکّہ کے شب زادگاں نے مہاجر کیا

کوئی بستی کہ بَن ہو

مجھے اس کی سُنّت نبھانی ہے

اس کا سلیقہ وہ پانی ہے جو دل سے دل تک

یونہی صاف شفّاف بہتا رہے گا

یہ ہجرت وراثت ہے میری

جہاں بھی رہوں گا

وہاں میرے اجداد کی روشنی اور سائے

مِرے ساتھ ہوں گے

کہاں آ گئی ہو

چند سال اس طرف
ہم شناسا نگاہوں سے بچتے بچاتے
یہیں پر ملے تھے
تمھیں یاد ہے
کائنات ایک ٹیبل کے چاروں طرف گھومتی تھی
ہمیں دیکھ کر کتنے بوڑھوں کی آنکھیں
کسی یادِ رفتہ میں نم ہو رہی تھیں
مگر میں نے آنکھوں میں
اپنے لیے اور تمہارے لیے
مچھلیوں کی طرح تیرتے آنسوؤں میں تمنائیں دیکھیں

مجھے یاد ہے

جب کسی اجنبی مہرباں نے ہمیں پھول بھیجے

تو تم کتنی نروس ہوئیں

جلد ہی خوف، خدشے ہوا ہو گئے

دوسری ٹیبلوں پر بھی گلدستے ہنسنے لگے

اب محبت کا مسکن کہیں اور ہے

یہ جگہ اب زباں بند دشمن کا منہ کھولنے کے لیے ہے

جہاں اپنی ٹیبل تھی اب اس جگہ ایک پھندا لگا ہے

کہاں آ گئی ہو محبت کا کتبہ اٹھائے ہوئے

آؤ آگے چلیں

بالجبر......

ہر طرف کترنیں ہیں
وہ گڑیا یہیں تھی مگر اب دکھائی نہیں دے رہی
اور یہ دھاگے،
یقیناً وہ گیسو ہیں جن کے لیے میری راتیں کٹیں
روئی دھنکی ہوئی ہے
کہیں خون کا کوئی دھبہ نہیں
اک طرف اس کی پوشاک ادھڑی پڑی ہے
ادھر اس کی آنکھیں، کٹے ابروؤں سے الگ،
خوف و دہشت میں لتھڑی ہوئی

ہر طرف کترنیں ہیں

بدن ریشہ ریشہ ہے

نیچے کا دھڑ چیل کوّے اٹھا لے گئے ہیں

لبوں پر لہو جم گیا ہے

(لہو، جو یقیناً کسی اور کا ہے)

گلے پر کسی گُرگ کے دانت کھنچے ہوئے ہیں

وہ گڑیا نہیں ہے مگر ہر طرف کترنیں ہیں

میں آئندہ گڑیا کی خاطر کپاس اور دھاگے نہیں لاؤں گا

کترنیں لے کے اپنی کسی اور جانب نکل جاؤں گا

کوئی رستہ نہیں

عجب اِک دُھول اُڑتی ہے
دمکتے، لہلہاتے کھیت اب کچھ بھی نہیں کہتے
سسکتے پنگھٹوں پر چیختی ہے آرزومندی
ہوا سُونے بنوں میں آشنا چہرے ترستی ہے

کبھی سرسوں میں ہم کِلکارتے جگنو پکڑتے تھے
کوئی لڑکی چُنریا میں گلاب اور بیر بھرتی تھی
وہ کھیلیں خواب کے شمشان میں پَل پَل سلگتی ہیں
کوئی جھونکا چُنریا کی گلابی باس اس جانب نہیں لاتا
مجھے اب کوئی بھی منظر نہیں بھاتا

وہ بہتی ندیاں اب گرد ہیں
ان کے کناروں پر اُگے کانٹے لہو میں رقص کرتے ہیں
عجب اِک دھول اُڑتی ہے
کوئی رستہ نہیں ملتا
کبھی اس شوخ لڑکی نے جو پودوں میں چھپایا تھا
وہ اِک بستہ نہیں ملتا

کھیل کا سامان

فلک پر پھسلتا ہوا آفتاب ایک تمثال ہے
بخیہ، بخیے میں پیوست ہوتا ہوا،
انگلیاں پارچوں کی سلائی میں مصروف ہیں
(صبح سے شام تک ایک جبری مشقت پہ مجبور معصومیت)
ایک گولے میں ڈھلتی ہوئی کوئی شے ارتقا کر رہی ہے

شفق اپنی آغوش میں سارے دن کے تھکے مہر کو لے چکی
یونہی ٹانکے لگاتے ہوئے دھیان ماں کی طرف جائے اور کوئی ٹانکا
سرک جائے تو گال پر دستِ جابر کِھلا تا ہے پھول

آفتاب ایک تمثال ہے
انگلیاں پھر سے ادھڑے ہوئے دائرے کو بنانے لگی ہیں
زمیں پر پڑے پارچے رفتہ رفتہ بُنت میں سمٹتے چلے جا رہے ہیں
شبِ مہرباں چند ساعت ڈھلی ہے
اِدھر اُس کے ہاتھوں میں فٹ بال مہتاب کا منہ چڑانے لگا ہے

خموشی سے تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا،
خشک روٹی کے ٹکڑے چباتا ہوا
ایک معصوم پیکر ان آنکھوں کی شہوت سے لرزاں ہے
جو اَب جھپٹنے کو تیار ہیں

شاعری اور پرندے

یہ پرندے عجب ہیں
کوئی ثانیہ وصل کا، گیت میں کھلکھلاتے ہوئے بول
بچّے کا بوسہ،
کوئی رنگ، منظر، خیال اِن کا دانہ
کسی ماں کے ہونٹوں کی ٹھنڈک،
کسی بانسری کی مدُھر تان اِن کی غذا
آشیانے سے کم کم نکلتے ہیں

آنکھوں کے گوشوں میں سمٹے ہوئے

یہ پرندے عجب ہیں
مِلن کا سمے ہو کوئی یا بچھڑنے کی رُت ہو
انہیں قحط کا ڈر نہیں
فصلِ غم، موسمِ شادمانی برابر ہے اِن کے لیے
یہ ہنسی اور خوشی دونوں ان کی رُتیں
دام کے خوف سے ماورا یہ پرندے عجب ہیں
زمانوں سے آنکھوں میں ہیں
موسموں کا بدلنا انہیں اذنِ ہجرت نہیں
شاعری ان چہکتے ہوئے شبنمی طائروں کی کتھا،
اِن کا احوال ہے

عید کے چاند سے (۱)

اے مہِ نو!
مبارک تجھے ساعتِ خوشگوار
یونہی بڑھتا رہے آگے آگے ترا راہوار
اے مہِ نو!
چمک ان کے خیموں پہ بھی
جو کئی قرن سے مورچہ مورچہ گھومتے ہیں عزیزوں سے دُور
ان کے دل میں اتر
جو شفا خانوں کے تنگ کمروں میں ہیں جاں بلب
ان کو مژدہ سنا
جو رہائی کی امید میں بے گناہی کا دکھ جھیلتے ہیں یہاں
اس کنواری کی آنکھوں میں بس
جو ملن کے سمے کے لیے فرقتِ دائمی کی سزا کاٹتی ہے
مہِ نو! درخشاں ہو ان طاقچوں پر کھلونے جہاں مر رہے ہیں
جنہیں ہاتھ بچوں کے چھونے سے محروم ہیں

اے مہِ نو!

بصارت سے محروم آنکھوں میں آئندہ کے خواب رکھ
کبھی اپنی کرنوں سے ظلمات کی چادریں دھو
دُور دیسوں گئے نوجوانوں کی ماؤں کے آنسو سمیٹ

اے مہِ نو!

فلسطین و کشمیر و افغان کے زخم دیکھ
ان عراقی مقامات پر نور پھیلا جہاں بین ہی بین ہیں
ان سروں، مرقدوں پر درخشندہ ہو
ہست سے نیست کے منطقے میں جنہیں پاؤں رکھ کر قرار آ گیا

عید کے چاند سے (۲)

اے مہِ نو!

یہ دارالخلافے کی اونچی عمارات،

انسانیت کے یہ زندان

تیرے ابھرنے سے، گھٹنے سے

ہیں بے نیاز

آسماں بوس نیویارک، لندن، جنیوا و پیرس

تجھے جانتے ہی نہیں ہیں

وہاں روشنی دے

جہاں پھول بچوں کے رخسار بارود کی بُو میں جھلسے ہوئے ہیں

وہاں ضوفشاں ہو جہاں ماؤں کی چھاتیاں

دودھ کی بوند کے معجزے کے لیے

آسماں کی طرف دیکھتی ہیں

جہاں سُورمے گھر سے باہر قدم رکھ کے

آگے ہی آگے کی دُھن پر تھرکتے ہیں،

مُڑ کر نہیں دیکھتے

کتنے آویزے، غازے، سنگھار ان کی رہ دیکھتے ہیں

مگر وہ پلٹنے کی ذلّت کے عادی نہیں

پنگھٹوں پر بھری گاگریں اور گھڑے جب چھلکتے ہیں

تو آنکھیں رکتی نہیں

اے مہِ نو!

یہ عید اپنے ہمراہ ہر چیز لائی ہے

لیکن جو پچھلے برس جی رہے تھے کوئی ان کا سندیس لاتا نہیں

اے مہِ نو!

انہیں عزت و جاہ کی موت مرنے پہ تکریم دے

وہ - نمی جن کی آنکھوں میں آئی تو ڈھلکی نہیں

عید کے چاند سے (۳)

چوڑیوں کی کھنک،
آنچلوں کی مہک اور مہندی کی خوشبو میں بازار بھیگے ہوئے ہیں
دکانوں، سٹالوں پہ اور ٹھیلے والوں کے آگے
ہنسی سلسلہ وار بہنے لگی ہے
کہیں آئنوں میں سنورتی ہوئی گوریاں اپنی آنکھوں میں ارمان،
بانہوں میں گجرے سجانے لگی ہیں
کہیں مانگنے والے ہونٹوں پہ بھی
مسکراہٹ کے فوّارے چلنے لگے ہیں
مہِ نو! مگر کتنے گھر ہیں جہاں بتّیاں گُل ہیں
اور سرد چولہوں کی راکھ اُڑ رہی ہے

خداوندِ اکبر کی تقسیم کا سلسلہ فہم سے ماورا ہے
ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں لیے کتنے پھول
اپنے ہونے کا نقش ونشاں ڈھونڈتے ہیں
کھلونے اٹھائے ہوئے،
کھِلکھِلاتے ہوئے کوئی گُل جھومتا ہے
تو یہ حیرت افروز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں
نگاہوں میں شبنم، لبوں پر جمی پپڑیاں جانے کیا کہہ رہی ہیں
کوئی چمچماتے ہوئے بُوٹ کی سمت یوں دیکھتا ہے
کہ پالش کی لَش لَش سے گویا نمی کھینچتا ہو

مہِ نو!
کسی گاؤں میں منتظر آنکھ دیکھی ہے تُو نے!
جو تیرے نکلتے ہی اس شہر سے آنے والی
ہر اک بس کے ہارن کو یوں سُن رہی ہے
کہ جیسے مسیحا مریضوں کی دھڑکن سنے
کون برہن ہے جو ماہیا چھیڑ کر چیرتی ہے جگر

اے مہِ نو!

تجھے تیرا ہونا مبارک مگر ایک شاعر کا دل

ان مناظر نے گھیرا ہوا ہے

خداوندِ قدّوس کے روبرو ان کا احوال بھی عرض کر

جو تبسّم بھلائے ہوئے آج بھی دوسروں کے لیے

جی رہے ہیں

عید کے چاند سے (۴)

اے مہِ نو!

کبھی تُو ابھرتا تھا تو ہر طرف سے

'مبارک، مبارک، سلامت سلامت' کی آوازیں آتی تھیں

میں نے ترا ذکرامّی کے قصّوں میں پہلے پہل جب سنا تھا،

میں بچہ تھا

اور پھر ذرا عمر بھیگی تو افسانوں، غزلوں، قصیدوں میں، نظموں میں

تُو بولتا تھا

کہیں خواب میں تجھ کو چھونے کی حسرت مچلتی

تو میں ہاتھ اپنا بڑھاتا

مگر نارسائی کا وہ کربِ لا انتہا ہی مقدّر رہنا

آدمی کے قدم تیرے آنگن میں اترے

گُلِ ماہتاب اب عجائب گھروں میں ہے

اور تجربہ گاہ میں خوردبینیں اٹھائے ہوئے

اُجلے کوٹوں میں ملبوس چہرے کھڑے ہیں

(یہ فطرت کے قاتل)

تُو اب تذکروں میں نہیں ہے

وہ غزلیں، وہ نظمیں، فسانے نجانے کہاں ہیں

جہاں میں تجھے چھو سکا تھا

مہِ نو!

کہیں آدمی کی بہیمانہ خصلت سے مجبور ہو کر

پرندوں سی ہجرت نہ کرنا

اگر دکھ فزوں ہو،

زمینوں کا گرد و غبار آخری حد کو پہنچے،

تو شاعر کا سینہ ہی محفوظ جائے اماں ہے

میں تجھ کو لہو میں مچلتی ہوئی آرزوئیں لیے دل کشادہ ملوں گا

امکان

خزاں نے سونا اُگل دیا ہے
کہیں کہیں سبز پات فردا سے آنے والے
مہیب لشکر کو دیکھتا ہے
لُٹے ہوئے شاخچوں سے مہتاب جھانکتا ہے
وہ طنزیہ آنکھ سبز پتّے کے خون میں سرسرا رہی ہے
میں جبرِ فردا سے آشنا ہوں
بہت سی آنکھیں تھیں جن میں کل چہچہا رہا تھا
وہ تتلیاں جن کے رنگ فردوس آشنا تھے
وہ لڑکیاں جن کے ہونٹ امکان کی نوا تھے
خزاں سے پہلے فضا میں جذبوں کی اک نمائش لگی ہوئی تھی

یہیں سے میں نے
وصال کا دُکھ،
بہار کا غم،
ہنسی کا رونا
متاعِ جاں کے عوض خریدا
بہارِ کم دیدا بھی نگاہوں میں جی رہی تھی
میں آخری بات کی علامت نہیں بنا تھا
اور اب بھی تتلی
لہو کی زرد اور گرد آلود سلطنت میں،
گلاب کی دُھن میں،
اُڑ رہی ہے

شام بے نام

قطرہ قطرہ تمہاری یاد کا زہر
رگ و پے میں اترتا جاتا ہے
ہجر کی فصل سر تک آ پہنچی
وصل کا دن گزرتا جاتا ہے
دل میں تاریک شام اترتی ہے

کوئی لمحہ نہیں ہے تابندہ
کوئی امکاں نہیں کہ آس لگے
ہر طرف ہے غبارِ تنہائی
ہر ہیولا اُداس اُداس لگے
تیرگی بام بام اترتی ہے

تم نہیں ہو تو کوئی بات نہیں
کوئی پرچھائیں ، کوئی یاد تو ہو
کچھ تو تسکینِ دل کا ہو ساماں
اپنے ہونے کا اعتماد تو ہو
زندگی ایسے کب گزرتی ہے

اوقات سے باہر

ہمارے نام کی فالیں نکلنے میں بہت سے قرن باقی ہیں
زمستاں میں دبی ہے اپنی چنگاری
یہ جاڑا جائے تو شاید خبر نکلے
ہمارے بخت کی ہانڈی کبھی چولہے نہیں چڑھتی
گزرتا وقت سب میں بٹ چکا ہے
(سو ہمیں اوقات سے باہر کہیں رکھا گیا ہے)
رات ڈھلتی ہے مگر آنکھوں کی تاریکی نہیں جاتی
ہمارے لفظ تیرہ ہیں
اجالے، ہم نے جو سطروں میں رکھے تھے
وہ آسیبی اناؤں نے نگل ڈالے
دلوں کے سرد خانوں میں ہمارے لفظ ہیں
ان میں حرارت ہے
مگر اک شعلۂ بے مایہ کیسے دہر کو گرمائے
(اس میں تاب کتنی ہے)

ہماری صبح کے سب استعارے

شب کے تابندہ ستارے

کھانستی نسلوں کے طعنوں نے مَسل ڈالے

کہیں سے روشنی آئے تو کیسے

جُھرّیوں میں لپٹے ہاتھوں نے لووں کو ڈھانپ رکھا ہے

ہمیں وہ شب زدہ کہتے ہیں

اپنے نام کی فالیں نکلنے میں ابھی کچھ دیر ہے

آراء کے نرغے میں ہمارے لفظ آوازیں ترستے ہیں

ہمیں فالیں نہیں پڑھنی

فنکار ہاتھ

اک سلائی سے اک دائرہ اون کا جھانکتا ہے
گرہ دونوں ہاتھوں سے ترتیب ہو کر نکلتی ہوئی سلسلہ بن رہی ہے
عجب انگلیوں کے گھماؤ میں پھرتی سلائی طلسمات کرنے لگی ہے
ہوا ایک جانب میں سہمی کھڑی ہے
سمجھ میں نہیں آرہا
ایک جانب دھرا ایک گولا بھلا کس طرح گھل رہا ہے
سلائی بہت دھیرے دھیرے بدن ڈھانپتی ہے
وہ پردہ جو پہلے بہت کم احاطہ تھا آہستہ آہستہ بڑھنے لگا ہے
سویٹر میں کھلتے ہوئے پھول آواز دینے لگے ہیں
کوئی لمس اترتا ہے سینے میں اور بازوؤں میں

نجانے وہ ہاتھ اس گرہِ دارِ فن میں کہاں تک گئے ہیں
اگر پھول کا ربط سانسوں سے کٹ جائے
خوشبو نہ بولے
تو فنکار ہاتھوں کا رعشہ بجا ہے
وہ ہاتھ اس ہنر سے شناسا ہیں
جو لمس در لمس احساس میں جھانکتا ہے
ہنر جو سلائی سے رنگِ جدا ٹانکتا ہے
وہ ہاتھ اپنی گرمی سے جاڑوں کی رہ روکتے ہیں

قصہ کہانی

کہانی ختم ہوتی ہی نہیں ہے
اَن کہی کتنی کتھائیں ہیں جو دھیرے دھیرے
در آتی ہیں لفظوں میں

میں ہر شب اک نیا قصہ سناتا ہوں
کسی معصوم شہزادی کا، جن کا، دیو کا، ساحر کا
لیکن صبح کو پھر قصہ پیچھے کو سرک جاتا ہے
اکثر سوچتا ہوں
جانے کب وہ رات آئے گی
کہانی ختم ہو گی
نیند کی بانہوں میں دے کر شہر کو
میں صبح سے پہلے کسی جانب نیا قصّہ سنانے کو نکل جاؤں گا

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com

آپ کی کتاب کا خوبصورت تحفہ ملا۔ اس سے قبل یہ کتاب صابر ظفر صاحب کے پاس دیکھ چکا تھا۔ مجھے آپ کے شعری فن میں ندرت اور تازگی نظر آئی۔ خدا کرے کہ جنوں کا یہ سلسلہ دراز رہے۔

آصف فرخی

آپ کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے جو ہمارے نظم نگاروں میں رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا تصوف کے ساتھ معاملہ کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ مخفی ہی رہے تو اچھا ہے لیکن آپ کے اس میلان نے آپ کی زبان کی گرہ کھول دی ہے۔ مبارک باد!

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

آپ کی کتاب "مہاجر پرندوں کی نظمیں" نے مجھے حیرت اور خوشی بخشی۔ اس میں مجھے امیج، تجرید، تلازمہ اور زبان کی وہی گھمبیر فضا محسوس ہوئی جو مجھے پسند رہی ہے۔ آپ اپنی نظموں کے آئینے میں کسی بھی طرح معمولی شاعر نہیں لگتے۔

احمد صغیر صدیقی

"مہاجر پرندوں کی نظمیں" گزشتہ ربع صدی میں نظم کی مقبول ترین تحریک امیجزم کی اس لہر سے منسلک دکھائی دیتی ہے جو دریا سے تعلق توڑے بغیر اپنی جلوہ آرائی پر یقین رکھتی ہے۔ یوں تابش کمال نے امیج کو ابہام کی دلدل میں گم ہونے سے بھی بچایا ہے اور لایعنیت کے بھنور میں کرتب دکھانے سے بھی گریز کیا ہے۔ مزید یہ کہ انفرادیت کے لمحاتی ابال میں دریا سے باہر جست لگا کر زندگی مختصر کر لینے کا طریقہ بھی نہیں اختیار کیا۔ وہ قطرے میں دجلہ دیکھنے کی روایت سے خوب آگاہ ہے لہٰذا اس کے امیجز سطح پر بلبلوں کی طرح چھب دکھا کر معدوم نہیں ہو جاتے بلکہ تہ میں پڑے موتیوں کا رنگا رنگ عکس ترتیب دے کر غوطہ زن ہونے، ان تک پہنچنے اور انھیں پہچاننے کے عمل تک ذہن کو متحرک رکھتے ہیں اور اس کی نظم کا جمالیاتی شعور قاری کو معانی کی دریافت میں دیر تک زیرِ سطح رہنے کے لیے آسودہ ماحول فراہم کرتا ہے۔ اس حد تک کہ قاری خود نظم کے ماحول کا حصہ بن جاتا ہے اور جب شاعر کو صبح کے ساحل پر بیٹھی زندگی آواز دیتی ہے تو وہ بھی اس دھندلکے میں وہاں جانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے جہاں دن رات اور ملنا بچھڑنا ایک جیسا ہے۔ ان نظموں کی شعریت قاری کو جل پری کی طرح نظم کے اندر سیر بینی کے دوران متعدد بار ایسے طلسم کدے میں لے جاتی ہے جہاں امیجز کے باہم تضاد و تفاوت سے ترتیب شدہ زندگی کا ایسا مرقع منتظر ہوتا ہے جسے صرف وحدت کے آنسوؤں سے دھلی ہوئی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ نظم قصہ شب میں خونخوار بھیڑیوں کی سرخ آنکھیں، مصلے پر دوزانو روشن قلب اہلِ باطن، پنگھوڑوں میں چمکتے ہوئے چہرے، بستر بدلتی لڑکیاں،

(باقی دوسرے فلیپ پر)

زہر اگلتے سانپ، دیوار پھلانگتے سائے، لرزتی غراتی بلیاں، سہمے ہوئے پرندے اور آواز کے خال و خد میں سرگوشیاں، قہقہے، منتر، آہٹیں، آہیں، غراہٹیں اور وصل آثار سانسیں یعنی خیر اور شر اپنی جملہ خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ ایک فریم میں یوں سما جاتے ہیں کہ آنکھ اور تصویر میں بھی دوئی کا فرق معدوم ہو جاتا ہے۔ ایسے ویژن والے شاعر کے بارے میں بڑی شاعری کی منزل تک جا پہنچنے کی پیش گوئی کوئی مشکل امر نہیں۔

علی محمد فرشی

آپ کی کتاب "مہاجر پرندوں کی نظمیں" نہ صرف بہت خوبصورت چھپی ہے بلکہ نظمیں بھی بہت عمدہ ہیں۔

ناصر عباس نیر

آپ نے چڑیوں کی طرح نظموں کے خوبصورت گھونسلے بنائے ہیں اور اپنی چہکار کو قائم رکھا ہے۔ تنگیٔ ظرف کے اس زمانے میں آپ کی شاعری کشادگیٔ باطن کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔

رفیق سندیلوی

"مہاجر پرندوں کی نظمیں" اسلوب کے نئے زاویوں اور متن کی نئی جہتوں کو روشن کرتا ہوا کلام ہے۔ اس میں جدید عہد کے ساتھ ساتھ قصباتی زندگی کا تال میل اس دوہرے پن کو سامنے لاتا ہے جس کے بوجھ تلے آج کے حساس آدمی کی زندگی سسک رہی ہے۔ مجھے یہ نظمیں بہت دلکش اور اثر انگیز لگیں۔

اختر عثمان

تابش کمال کا عصری اور سماجی شعور اسے اشیا کی ظاہری ہیئت کے اندر جھانکنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ ظلم اور بدصورتی دونوں ہی اس کی روح کو متلاطم کرتے ہیں۔ اسے دوسروں کی زندگی پر قفال بنانے سے نفرت ہے اور وہ ان سے مرعوب ہونے کی بجائے انھیں خبردار کرتا ہے کہ انھیں سفید فامی کا ناز لے ڈوبے گا۔

منصورہ احمد

لگتا ہے خوبصورت بات خوبصورتی سے کہنا تابش کی فطرت میں داخل ہے۔ تابش کمال کا جمالِ بیان اس کی بے ساختگی اور مختصر لفظوں میں بڑی بات کہنے کے فن میں پوشیدہ ہے۔ اس کی نظم جب سادہ الفاظ میں گزرے وقتوں کی کوئی بات دہراتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی گمشدہ قیمتی شے مدت بعد ہاتھ لگ گئی ہو۔

سعید اکرم

آپ کی نظموں کا مزاج اور تحریر کی پاکیزگی آپ کی باطنی روشنی کی غماز ہے۔ آپ نے فقط نظمیں ہی نہیں لکھیں، سطر سطر اجالوں کی داستان رقم کی ہے۔

طاہر شیرازی

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، **چکوال**
www.darulkamal.com



نئی نظم معنی اور ہیئت کے درمیان ایک نئے سمجھوتے کی جستجو کرتی ہے کیونکہ پرانے سمجھوتے اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں کچھ زیادہ ہی پرانے ہو گئے ہیں۔ امیج، تجرید، تلازمہ اور زبان کا بدلا ہوا برتاوا نئی نظم کو متشکل کرتے ہیں۔ لیکن شاعر اسے زندگی کے ایک مجتمع اور وسیع تر ویژن کے تابع رکھنے کی کاوش بھی کرتا ہے۔ معنی و ہیئت کی اسی تال میل میں، حاشیے کے اندر ادا ہوتی ہوئی نظم کبھی حاشیے سے باہر بھی نکل جاتی ہے۔ ایسے نئے تجربے سے مربوط تخلیقی عمل سے گزرنا کوئی آسان کام نہیں۔ تابش کمال اپنی نظم میں اسی مشکل عمل سے گزرتا ہے۔ فطرت کے اَن گنت مظاہر اور موجودات میں خیر و حسن کی شناخت، انسانی زندگی میں خواب اور آئیڈیلز کی شکست کا ادراک، عصری مسائل سے آگاہی، اپنے تہذیبی تشخص کا فہم اور تصوف پاتا ہوا غم تابش کمال کے شعری منظرنامے کو وسیع اور ہمہ رنگ بناتے ہیں بلکہ نا آفریدہ کی یافت کا سفر اگر جاری رہے تو یہی عناصر بڑی شاعری کی اٹھان بھی بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر تین نظمیں، 'ساربان'، 'قصہ شب' اور 'بے گھری' شاعر کی جولانئ طبع کی تین سمتوں کی طرف اشارا کرتی ہیں۔ بیشتر نظمیں اس مجموعے کے عمومی معیار سے نیچے نہیں اترتیں بلکہ فکری اور محسوساتی سطح پر نئے امکانات کا تاثر بھی دیتی ہیں۔

تابش کمال کی نظم کا نمایاں عنصر اس کی شعریت ہے جو ہر نظم میں ایک فطری بہاؤ کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی شعریت شاعری کو نثر سے ممیز کرتی ہے اور شاعری کی شرطِ اول بھی ہے۔ ایک اور بات جو اس مجموعے کو قابلِ توجہ بناتی ہے وہ امیجز کی زرخیزی اور عکسوں کی فراوانی ہے جو ایک علیحدہ مطالعے کا تقاضا کرتی ہیں۔ تابش کمال کی یہ نظمیں ایک نئی توقع کا در کھولتی ہیں اور ایک نئے امکان کی نوید دیتی ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم

تابش کمال "مہاجر پرندوں کی نظمیں" لے کر جہانِ ادب میں جمہوری کے شائستہ اسلوب اور دانش و عرفان و آگہی کی تہذیب کے جس رس اور رچاؤ کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں اس سے ایک خوشگوار فرحت و طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ نیا ہونے کی جستجو میں اپنی مٹی اور اپنے وسیب سے بے نیاز ہو جانا، جناتی لغت کے استعمال سے ایک مصنوعی اور ماورائی فضا قائم کرنا، سنسنی خیز اور ہیجان انگیز موضوعات پر جمالیاتِ شعر سے ماورا اظہار کے ذریعے وقتی تشہیر کے لیے شاعری کو شعار کرنا جب بازارِ ہنر میں، وقتی طور پر ہی سہی، رواج پا رہا ہو تو ایسے میں تابش کمال جیسے سنجیدہ، متین، سچے، کھرے اور سچے شاعر کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اردو میں کوئی باقاعدہ شاعری کا امیجسٹ اسکول تو نہیں ہے مگر جن تخلیق کاروں نے تمثال نگاری اور پیکر تراشی کے ذریعے اپنے مصرعوں کو سجایا ہے، تابش کمال یقیناً اس روایت کے بہت اہم شاعر سمجھے جائیں گے۔ جمالیاتی جامعیت کے ساتھ، امیج، حسنِ شعر میں ایک ایسی جہت پیدا کرتی ہے جو اظہار و بیان کے سارے قرینوں میں اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتی ہے۔ تصوف کی وجدانی فضا کے پس منظر میں، اپنی مٹی سے نمود و ظہور کرنے والے موضوعات کو تابش کمال نے فن کی تمام دل آویزی کے ساتھ نظموں میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ نظمیں اپنے موضوعات، اپنی لغت اور اپنے آہنگ و لحن کے سبب اردو کی عصری شعری روایت میں یقیناً وسعت کا باعث بنیں گی۔

افتخار عارف

دارالکمال، کمال آباد، پنڈی روڈ، چکوال

www.darulkamal.com